(غلام گردش)

بڑھاپے کیلئے وسائل ضرور جمع رکھیے!

گاڑی کے شیشہ پر ایک بزرگ آدمی نے ہاتھوں سے دستک دی اور مکمل خاموش ہو کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں میں حد درجہ بے بسی تھی۔ سب سے عجیب بات تھی کہ نہ اس نے پیسے مانگے نہ ہی کسی امداد کیلئے اشارہ کیا۔ شیشہ کھول کر پوچھا کہ بتایئے، کیا مسئلہ ہے۔ جواب حد درجہ سادہ سا تھا۔ بھوکا ہوں، کھانا کھانا چاہتا ہوں۔ اسطرح کے جملے اکثر اوقات سننے میں آتے ہیں۔ بزرگ کے کپڑے خستہ حال مگر قدرے صاف تھے۔ گاڑی روک کر میں نے انہیں ساتھ بٹھا لیا۔ ذہن میں یہ بھی آیا کہ کوئی جرائم پیشہ انسان نہ ہو مگر میں تو بھرے چوک میں تھا۔ فردوس مارکیٹ چوک لاہور کے اردگرد دکانیں ہی دکانیں ہیں۔ ہر طرح کی دیدہ زیب دکانیں۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹل اسکے علاوہ ہیں۔ جیب سے سو روپیہ نکال کر بزرگ کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ تڑپ کر بولا۔ جناب میں فقیر نہیں ہوں۔ حالات کا مارا ہوا ہوں۔ خیر درمیانے سے ہوٹل پر گاڑی روکی اور بزرگ کیلئے کھانا منگوا لیا۔ بڑی تمیز سے کھانا کھایا۔ دعا دیکر اُٹھنے لگا تو میں نے عام سا سوال کیا کہ آپ کون ہیں۔ اس حال میں کیسے پہنچ گئے۔ بزرگ دوبارہ آرام سے بیٹھ گیا۔ میں حکومت کے ایک سرکاری دفتر میں بطور کلرک کام کرتا تھا۔ ریٹائر ہوئے دس برس ہو چکے ہیں۔ میرے دفتر میں پنشن نہیں ملتی تھی بلکہ ریٹائرمنٹ کے وقت چند لاکھ دے دیے جاتے تھے۔ انہی پیسوں سے لاہور کی ایک معمولی سی بستی میں تین مرلے کا مکان خرید لیا۔ کثیر الاولاد ہوں۔ پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ بیوی بہت عرصے پہلے خدا کے پاس جا چکی ہے۔ مجھے اس پورے بیانیے میں کوئی بھی چیز غیر معمولی نہیں لگی۔ کھانے کا بل دیکر اُٹھنا چاہتا تھا۔ بزرگ آدمی نے بڑے احترام سے روکا اور بتانے لگا کہ صاحب، میری بات پوری سن لیجئے۔ پھر چلے جایئے گا۔ مجبوری کے عالم میں وہیں دوبارہ بیٹھ گیا۔ بزرگ شخص نے دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔ انتہائی سادگی سے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کی۔ ایک دن چھوٹا بیٹا میرے پاس آیا۔ کہنے لگا کہ اس نے کوئی کاروبار کرنا ہے۔ اسے کچھ پیسے چاہییں۔ میرے پاس صرف پچاس ہزار روپے تھے۔ اولاد کی ترقی سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے۔ پیسے فوراً بیٹے کو دے دیے۔ اس نے منڈی میں فروٹ کی دکان کھول لی۔ کاروبار چل پڑا۔ اس نے نئی موٹر سائیکل بھی خرید لی۔ ایک دن، پیسے واپس لینے کا تقاضا کیا کہ مجھے شوگر اور بلڈ پریشر کی دوائی لینی ہوتی ہے۔ جواب تھا کہ ابھی کاروبار درست طریقے سے نہیں چل رہا۔ تھوڑی دیر بعد واپس کر دونگا۔ بہر حال وہ وقت کبھی بھی نہ آ پایا۔ پیسے کے لحاظ سے مکمل قلاش ہو گیا۔ بیٹے کو تمام جمع پونجی دینا میری سب سے بڑی غلطی تھی۔

خیر اولاد سے قرض لیکر، بھکاریوں کی طرح مانگ مانگ گزارہ کر رہا تھا۔ دو سال پہلے، میرے تمام بیٹے اور بیٹیاں گھر آئے۔ کہنے لگے کہ ان سب کو کسی نہ کسی طریقے سے مالی تنگی کا سامنا ہے۔ لہذا گھر بیچ کر انہیں انکا حصہ دے دوں۔ منفی جواب پر کہنے لگے کہ اگر میں نے انکار کیا تو مجھے گھر سے نکال دینگے اور عدالت کے ذریعے اپنا حصہ وصول کر لینگے۔ سرکاری دفتر میں ساری عمر کام کرنے کی بدولت، عدالتوں کے دھکوں کا بھرپور علم تھا۔ یہ بھی پتہ تھا کہ اب میں کمزور ہوں اور اولاد میرے اوپر ہاوی ہو چکی ہے۔ لہذا میں نے ایک شرط پر حامی بھر لی۔ وہ یہ، کہ ٹھیک ہے تین مرلے کا مکان فروخت کر کے تمام اولاد کو انکے پیسے دے دیتا ہوں۔ پر تمام بچوں کے پاس دو تین ماہ

رہونگا۔اتنا وقت گزرنے کے بعد، پھر دوسرے بچہ یا بچی کے پاس چلا جاؤنگا۔یہ بات طے ہوگئی۔اپنا مکان فروخت کر کے،تمام پیسے اولاد میں تقسیم کر دیے۔یہ میری بہت بڑی غلطی ثابت ہوئی۔قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ اگر میرے سر پر چھت نہ رہی تو ہر طریقے سے سڑک پر آجاؤنگا۔خیر شروع میں بڑے بیٹے کے گھر منتقل ہوگیا۔وہ ایک ورکشاپ میں مستری کا کام کرتا تھا۔گزارہ ٹھیک ہو رہا تھا۔ایک دن میں نے کہا، کہ دوائیاں ختم ہوگئی ہیں۔تھوڑے سے پیسے دے دو۔جواب تھا کہ اپنی بیوی کو دوائی کے پیسے دے ڈالے ہیں۔لہذا اس سے لے لو۔خیر، بہو سے تقاضا کرنا عجیب سا لگا۔ایک دو گھنٹے سوچ کر بہو سے پانچ سو روپے مانگے۔اسکا جواب بہت تلخ تھا۔گزارہ نہیں ہوتا اور آپکو دوائیاں چاہییں! میرے ہاتھ پر سو روپیہ رکھا اور کہا کہ اس وقت اتنے ہی پیسے ہیں۔لہذا گزارہ کروں۔اتنی مشکل بات سنکر سن ہوگیا۔ایسے لگا کہ ذہن پر کوئی ہتھوڑے مار رہا ہے۔دوائی لیکر گھر واپس آیا۔شام کو بیٹے کو ساری روداد سنائی تو وہ خاموشی سے کہنے لگا کہ اباجی، مالی حالات کافی مشکل ہیں۔آپ اسطرح کریں کہ چھوٹے بیٹے کے گھر چلے جائیں۔مگر تم نے تو ابھی نئی موٹر سائیکل لی ہے اور ہر دوسرے تیسرے دن بیوی کو نیا سوٹ لا کر دیتے ہو۔بیٹے نے کیا جواب دینا تھا۔بیوی تڑپ کر بولی، کہ آپ تو ہماری ہر چیز پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔بہتر یہی ہے ہمارے گھر سے چلے جائیں۔

انتہائی لاچاری میں دوسرے بیٹے کے گھر چلا گیا۔پندرہ بیس دن بعد اسکا اور اسکی بیوی کا رویہ بے حد مشکل ہوگیا۔ناشتے کے وقت ناشتہ نہ ملتا تھا۔کھانا مانگ لوں تو ایسے محسوس ہوتا تھا کہ کوئی گناہ کر لیا ہے۔ایک روٹی اور تھوڑا سا سالن۔اس طرح تو لوگ گھر کے ملازموں کو کھانا نہیں دیتے۔بہر حال میں پورے ایک مہینے یہ ذلت برداشت کرتا رہا۔تیس دنوں کے بعد بالکل وہی ہوا جو پہلے ہو چکا تھا۔اس بیٹے نے بھی مجھے گھر سے نکال دیا۔میں خاموشی سے بزرگ کی بات سن رہا تھا۔کہنے لگا،فرداً فرداً پانچوں بیٹوں کے گھر گیا اور وہاں ذلت آمیز سلوک کی بدولت واپس چلا آیا۔ایک دن انتہائی مجبوری کے عالم میں اپنی منجھلی بیٹی کے گھر چلا گیا۔دو چار دن کے بعد، اسکے سسرال والوں نے لڑنا شروع کر دیا۔اسکی ساس میری مرحوم بیوی کی بہن تھی۔مگر انکے دل، اتنے قریبی رشتہ داری کے باوجود اتنے تنگ تھے کہ میں ہر لمحہ مرتا تھا اور ہر لمحہ جیتا تھا۔بلکہ جیتا کیا تھا، دوبارہ مرتا تھا اور پھر مرتا تھا۔وہاں بھی میری وجہ سے جھگڑا شروع ہوگیا۔بیزار ہو کر وہاں سے بھی نکل آیا۔تمام بیٹیوں اور بیٹوں کا رویہ بالکل ایک جیسا ادنیٰ تھا۔ایک دن تو اپنے پرانے گھر کے نزدیک ایک پارک میں سویا رہا۔اولاد کو معلوم تھا کہ گراؤنڈ میں سویا ہوا ہوں۔مگر کوئی بھی مجھے گھر بلانے کیلئے نہیں آیا۔اسکے بعد ایسے لگا کہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکا ہوں۔اندر شیشے کی کرچیاں ہی کرچیاں ہیں۔زخم ہی زخم ہیں۔سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اولاد جسے میں نے اپنے انتہائی محدود ذرائع میں پالا ہے، تعلیم دلوائی ہے۔ان میں سے کوئی بھی اپنے حقیقی والد کو گھر میں رکھنے کیلئے تیار نہیں ہے۔دل میں آیا کہ خودکشی کر لوں۔کسی مسجد کے مینار پر جاؤں اور وہاں سے چھلانگ لگا دوں۔شائد موت آنے پر، ہر غم سے آزاد ہو جاؤں۔پر خودکشی کرنے کی بھی ہمت نہیں کر سکا۔اسلیے کہ کمزور آدمی ہوں۔بہر حال، پھر یہ ہونا شروع ہوا کہ رات کو کسی دربار یا مسجد کے باہر زمین پر سو جاتا تھا۔جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔کیا کرتا۔رمضان آیا۔تو لائن میں لگ کر ایک گھر سے راشن لینے کیلئے کھڑا ہوگیا۔جب باری آئی تو وہ راشن میرا ایک رشتہ دار تقسیم کر رہا تھا۔شرم سے خالی ہاتھ واپس آ گیا۔اس رشتے دار نے بھی یہ نہیں کہا کہ رُک جاؤ۔تم کس حالت میں پہنچ گئے ہو۔اس نے

مجھے پہچاننے کے باوجود بھی بالکل نہیں پہچانا۔ واپس آ کر سڑک کے نزدیک بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اتنی دیر میں نزدیک سے ایک سائیکل والا گزرا۔ چہرہ شناسا تھا۔ وہ میرے ہی دفتر میں کلرک تھا۔ اسے بھی ریٹائر ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اپنے گھر لے گیا۔ گھر کیا تھا۔ ایک معمولی سا کمرہ تھا۔ اس نے کبھی شادی کی ہی نہیں تھی۔ اکیلا رہتا تھا۔ اس نے مجھے سر چھپانے کی جگہ دی۔ دونوں صبح کے گیارہ بجے کے قریب معمولی سا ناشتہ کرتے ہیں اور پھر تمام دن خالی پیٹ گزارا کرتے ہیں۔ دوائیاں، کسی ہسپتال میں جا کر زکوۃ فنڈ سے حاصل کر لیتا ہوں۔ آج شوگر کی وجہ سے بھوک بہت زیادہ لگ رہی تھی۔ لہذا، چوک میں کھڑا ہو کر بھیک مانگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بزرگ کی باتیں حد درجہ دکھی اور تکلیف دہ تھیں۔ میری جیب میں دو ہزار روپے تھے۔ میں نے اسکے ہاتھ پر رکھ دیے۔ آبدیدہ ہو کر اس نے قبول کیے۔ اُٹھتے ہوئے کہنے لگا کہ ایک باپ، محنت مشقت کر کے، کثیر اولاد کو پال لیتا ہے۔ مگر اولاد، ملکر بھی اپنے ماں یا باپ کو عزت سے گھر نہیں رکھ سکتے۔ ہاں دوسری بات، اپنے بڑھاپے کیلئے کچھ نہ کچھ بچا کر ضرور رکھیں۔ بڑھاپے میں سوائے آپکی جمع پونجی کے کوئی بھی آپکے کام نہ آئیگا۔ سب آپکو بوجھ سمجھ کر جان چھڑانے کی کوشش کرینگے۔ اپنے بڑھاپے کا خود خیال کرنا ضروری ہے۔

اس بزرگ آدمی سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ اسکے بعد چوک پر بھی کبھی نظر نہیں آیا۔ پتہ نہیں۔ کس حال میں ہوگا۔ زندہ بھی ہے یا دنیا سے گزر گیا۔ مگر اس واقعہ نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ ہمارے معاشرے میں اتنی بے ترتیبی اور بگاڑ آ چکا ہے کہ محترم رشتے بھی بیجان ہو چکے ہیں۔ اکثر اوقات، ماں باپ کو بڑھاپے میں اولاد بوجھ تصور کرتی ہے۔ خاص طور پر بہوئیں تو انہیں عذاب میں رکھتی ہیں۔ سب کی بات نہیں کر رہا۔ لازم ہے کہ ایسی نیک اولاد بھی ہے جو بوڑھے ماں باپ کو خوش وخرم رکھتی ہے۔ لاچارگی کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ مگر مجموعی طور پر معاشرے کی قدریں منفی معاشی خطوط پر اُستوار ہو چکی ہے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شادی کے فوراً بعد علیحدہ رہنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اور اکثر اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مغرب کی طرح اب سنگل خاندان کا رواج حد درجہ بڑھتا جا رہا ہے۔ قیامت تو یہ ہے کہ والدین اولاد کی محبت میں تن، من، دھن سب کچھ وار دیتے ہیں۔ مگر جب ضعیف ہو جاتے ہیں تو کئی بار انہیں اچھا سلوک نہیں ملتا، جو انکا بنیادی حق ہے۔ مجھے اس بزرگ کا نام بھی نہیں پتہ، جن سے ملاقات ہوئی تھی۔ مگر انکی ایک نصیحت بار بار کانوں میں گونجتی ضرور ہے۔ اپنے بڑھاپے کیلئے کچھ وسائل جمع کر کے ضرور رکھنا۔ ورنہ بڑھاپا رُل جاتا ہے!

راؤ منظر حیات